--- پشاور میں مشتعل مظاہرین نے تین سینما گھروں کو آگ لگا دی (ایک خبر)

صنعت سامری جلا ڈالی

--- فرانس - ۷۱ سالہ شخص نے اپنی پوتی سے شادی کرلی (ایک خبر)

فرانس سے آنے والے پاکستان میں بھی یہی کچھ چاہتے ہیں۔

--- عابدہ حسین اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مشورہ دینے کے بعد اب کشمیر کاز کو نقصان پہنچانے کے در پے ہیں (مولانا غلام محمود) ● سبائی اور رافضی تیرہ سو برس سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے چلے آئے ہیں۔

--- اسلامی شریعت کورٹ کی نہیں۔ پارلیمنٹ کی بالادستی چاہتے ہیں (بے نظیر)

کس منہ سے فاطمۃ الزہرؓ کو اپنا آئیڈیل کہتی ہو؟

--- پیپلز پارٹی کے لیڈر ملک مختار اعوان فاحشہ عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے موقع پر گرفتار (ایک خبر)

اس قبیلے کا ہر پیرو جواں گستاخ ہے۔

--- پی ڈی اے کی قیادت حکومتی مظالم کے خلاف مردانہ کردار کا مظاہرہ کرے۔ (طاہر القادری)

زنانہ قیادت سے مردانہ کردار کے مظاہرے کا مطالبہ "درمیانہ قیادت" ہی کرسکتی ہے۔

(بقیہ از صفحہ)

لپیٹ دی گئی ہے۔ اگر کوئی اکا دکا اللہ کا بندہ اپنے اسلاف کی امانت سنبھالے بیٹھا ہے تو اب اس سے آگے لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ کارخانۂ عالم کا نظام تا قیامِ قیامت چلے گا۔ اس نظام کا چلانے والا ہی اپنے سب کاموں کی حکمت جانتا ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی حسنات قبول فرمائے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے اور آپ کے نقشِ قدم پر ہم سب کو چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آنچہ از ما گمشدہ گر از سلیماں گم شدے

ہم سلیماں، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

- بقیہ از صفحہ ۲۴ -

شاہ جی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ لہٰذا مستقبل کی اولادِ آدم بھی ان سے اس روحانی استفادہ کو یقیناً جاری رکھے گی۔

رہِ وفا میں ترے بعد آنے والوں کو

قدم قدم پہ ملیں گے نشان منزل کے

بقیہ صفحہ 35

• معمار اور غیرت ملی و حمیت کا پاس دار خیال کرتے تھے۔ ان کی ذہنی و دلی خواہش تھی کہ علی گڑھ اپنے کردار کے لحاظ سے عظمت ملی کا گہوارہ اور اسلام کی شان کا ایک ایسا مجلا آئینہ ثابت ہو جس کی آب و تاب کو حالات و انقلاب کی کوئی آندھی بھی دھندلا نہ سکے۔

❁

مولانا محمد سعید الرحمن علوی

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر
(ایک دھماکہ خیز کتاب)

اس وقت جو سطور ہم تحریر کرنے بیٹھے ہیں اور جو "نقیب ختم نبوت" کے ذریعہ آپ کے سامنے آئیں گی۔ وہ واقعہ کربلا کے حوالہ سے ہماری کوئی طبع زاد یا تحقیقی تحریر نہیں بلکہ ایک کتاب کے تعارف کے حوالہ سے ہے جو حال ہی میں منصہ شہود پر آئی اور طبع ہوتے ہی اس نے ایک کہرام بپا کردیا

کتاب ہندوستان کے صوبہ یو۔ پی کے اس شہر سے شائع ہوئی جسے لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شیعہ اسکول کے اہم مرکز ہونے کے حوالہ سے اس شہر کی ایک تاریخ ہے پھر دیوبند اور علی گڑھ کی علمی تحریکوں کے بعد تیسری بڑی تحریک "ندوۃ العلماء" کے حوالہ سے بھی اس شہر کی ایک تاریخ ہے۔ اس شہر کا ایک تعارف "فرنگی محل" کا علمی خاندان و ادارہ بھی ہے جس کا اس ملت پر بڑا احسان ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں لکھنؤ ایک مستقل روایت کا حامل ہے، اہل لکھنؤ کی نزاکت کے بھی بڑے چرچے ہیں۔ ایک زمانہ میں اسی شہر سے ایک تحریک اٹھی جس کا مقصد کائنات کے سب سے سچے انسان، نبوت و عصمت کے خاتم، سرکار دو عالم و عالمیان محمد عربی صلوات اللہ تعالی علیہ و سلامہ کی تربیت یافتہ جماعت کے ذکر خیر پر پابندی لگوانا تھا۔ اس تحریک کو اٹھانے والے وہ رافضی تھے جن کا خمیر مدینہ و یمن کے یہودیوں اور ایران کے مادر پدر آزاد مجوسیوں کے گٹھ جوڑ سے اٹھا تھا۔ اسی تحریک کا رد عمل وہ تحریک تھی جو مجاہدین و کارکنان احرار نے اٹھائی اور مؤرخ نے غیرت مندوں کی اس تحریک کو "مدح صحابہ" کی تحریک کا نام دیا اور محمد عربی ﷺ کے سچے رب نے اپنے محبوب بندے کی تربیت یافتہ جماعت کے معاملہ میں اپنی عزت کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ رفض و سبائیت اور اس کے ملعون فرنگی سرپرست کی ساری تدبیریں الٹ گئیں۔

ماضی قریب میں اس شہر کی آبرو حضرت الامام مولانا عبد الشکور فاروقی نقشبندی مجددی تھے۔ جنہیں آج خدام صحابہؓ و ازواجؓ و بنات رسولؐ، "امام اہلسنت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہی مولانا لکھنوی جنہوں نے اپنے اخبار "النجم" کے ذریعہ رفض و سبائیت کے رسوائے زمانہ اور مکر و فریب کے مرکزی قلعہ پر ایسی بمباری کی کہ رفض و سبائیت کے علمبردار بلبلا اٹھے اور اگر میں یوں کہوں کہ آج اس شہر کی آبرو مولانا محمد منظور نعمانی اور ان کے فرزندانِ عزیز مولانا عتیق الرحمن اور محب گرامی مولانا خلیل الرحمن ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

سنبھل ضلع مراد آباد کا یہ خاندان ایک عرصہ سے لکھنؤ میں مقیم ہے جبکہ اس سے قبل اس خاندان کو مولانا احمد رضا خان کے شہر بریلی میں قیام کا موقعہ ملا۔ مولانا محمد منظور نے بڑی صفائی سے زیر تبصرہ و تعارف کتاب کے ابتدائیہ میں اپنے

آبائی قصبہ "سنبھل" کے حالات لکھوائے ہیں کہ وہاں کے سنی کس طرح محرم کے ایام میں رفض کا جامہ پہن لیتے حتیٰ کہ خود ان کے اپنے گھر میں علم کی کمی اور حقائق سے نا آشنائی کے سبب بہت کچھ ہوتا۔ لیکن قدرت اس خاندان پر یوں مہربان ہوئی کہ مولانا محمد منظور کو مرکز علم و ہدایت دیوبند میں تعلیم کا موقعہ مل گیا۔ اس وقت دیوبند کے افق پر علم و معرفت کے بڑے بڑے ستارے چمک رہے تھے۔ لیکن جس شخصیت کو نیر تاباں کی حیثیت حاصل تھی اس کا نام نامی سید محمد انور شاہ تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہی سید انور شاہ جن کے متعلق السید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرمایا تھا کہ "کشمیر کے ہمہ نوع حسن کو قدرت نے حسن مجسم کا رنگ دے کر انور شاہ بنادیا اور اب کشمیر میں کچھ نہیں" خوش قسمت مولانا نعمانی نے اس عظیم شخصیت سے کسب فیض کیا۔ پھر تدریس و تعلیم کی راہ اختیار کی حتیٰ کہ وہ بریلی میں پہنچ گئے اور "الفرقان" کے نام سے ایک رسالہ کا اجراء کیا (جس کی ساٹھویں جلد کا ساتواں شمارہ جولائی ۹۲ء میں سامنے آیا ہے) کچھ عرصہ بعد آپ اس رسالہ سمیت لکھنؤ آگئے۔ گویا یہ رسالہ اپنی زندگی کی ساٹھ بہار پوری کررہا ہے اور میں نے اپنی شعوری زندگی میں بہت سے نامور اہل علم کو یہ کہتے سنا کہ انہیں اپنی عملی زندگی میں اس رسالہ سے بہت فائدہ ہوا۔ جنوبی ایشیا کے اردو رسائل میں اتنی عمر کا شاید ایک آدھ اور رسالہ ہو، اور یہ بات طے ہے کہ اس رسالہ کا مخصوص علمی مزاج اور اس کی ثقاہت ہر زمانہ میں مسلم رہی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علمی انداز ہونے کے باوجود اسکی زبان ہمیشہ شستہ اور سادہ رہی یعنی بھاری بھرکم علمی اصطلاحات سے بچ کر ایک مخصوص معیار اپنایا گیا تاکہ اہل علم سے عامۃ الناس تک سبھی اس سے برابر استفادہ کرسکیں۔

مولانا نعمانی مختصر وقت کے لئے مولانا مودودی کی تحریک و جماعت سے بھی وابستہ رہے اور اس وابستگی کا مقصد محض اور محض دین اسلام کی خدمت تھی لیکن بانیٔ تحریک کے حقائقِ درون خانہ سے واقف ہونے کے بعد مخلص و متدین مولانا نے فوراً اس تحریک سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنی "داستان وصل و فصل" کو اس خوبی سے مرتب کردیا کہ جماعت اسلامی کے حلقے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ اس کتاب کی ایک ایک سطر سے للّٰہیت و خلوص ٹپکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ مولانا ہی تھے جنہوں نے مولانا احمد رضا خان کی "تحریک تکفیر" کے سامنے بند باندھا اور مولانا احمد رضا خان نے حضرت الامام مجاہد فی سبیل اللہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید سے لے کر مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی، مولانا خلیل احمد اور مولانا تھانوی تک جیسے بندگانِ اخلاص کے خلاف جو تکفیری مہم چلائی اس کا مؤثر انداز سے علمی توڑ کیا اس زمانہ میں ایک بہادر، صاحب علم اور سنجیدہ مزاج مناظر کے طور پر ان کی شہرت جنوبی ایشیا کے چپہ چپہ میں پھیلی ہوئی تھی حتیٰ کہ لاہور کا وہ معروف معرکہ جس کے منصف و ثالث علامہ اقبال، خواجہ صادق حسن اور مولانا فیروز الدین روحی تھے، اس معرکہ میں بھی اہل صدق و صفا کے وکیل مولانا نعمانی ہی تھے۔

ان کے رسالہ نے نصف صدی سے زیادہ کے سفر میں بعض یادگار نمبر شائع کئے اس عشق و محبت کے سفر میں زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مؤلف (مولانا کے بڑے لڑکے) کبھی دست و بازو رہے تو آج کل دوسرے فرزند خلیل میاں دست و بازو ہیں۔

مولانا ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے گویا اب ان کی عمر ۸۷ برس ہے۔ عمر کے حوالہ سے کئی عوارض انہیں لاحق ہیں لیکن ہمیشہ کی طرح قدرت اب بھی ان پر مہربان ہے اور اپنے معروف سلسلہ "معارف الحدیث" کو وہ مسلسل آگے بڑھا رہے ہیں تو دوسرے اہم موضوعات پر بھی ان کی تحریریں سامنے آتی رہتی ہیں۔ جس کا معنی یہ ہے کہ فضل الٰہی سے ان کے دل و

دماغ سلامت ہیں، علم مستحضر ہے اور اساتذہ و اکابر سے حاصل کردہ سرمایہ کو اللہ کی مخلوق میں لٹانے اور اس روشنی سے ظلمت کدہ دہر کو منور کرنے میں وہ اب بھی مصروف ہیں۔ (متع اللہ المسلمین ببقاءھم و نفع اللہ المسلمین بعلومھم و معارفھم)

مولانا کی زندگی کے اس دور کا عظیم کارنامہ ان کی وہ معرکتہ الاراء کتاب ہے جو "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" کے نام سے چند سال قبل ایسے وقت میں سامنے آئی جب ایران میں خمینی کے ذریعہ برپا ہونے والے انقلاب کا چار سو شہرہ تھا۔ قرآن و حدیث کی حقیقی تعلیم سے بے بہرہ اور دین اسلام اور پیغمبر و اصحاب پیغمبر کی غیرت سے عاری بندگانِ ہوس اسے "اسلامی انقلاب" کا نام دے رہے تھے ہر طرف حیرت و استعجاب اور خوف و دہشت کی فضا طاری تھی اور اس انقلاب کو دوسرے ممالک میں ایکسپورٹ کرنے کے منصوبے بن رہے تھے ایسے ماحول میں اللہ تعالی کے جو باتوفیق بندے سامنے آئے اور اس انقلاب اور اس کے بانی اور اس کے اندازِ فکر کی قلعی کھولی اور حقائق کو بے نقاب کیا انہیں مولانا سرفہرست تھے۔ ان کی کتاب پاکستان و ہندوستان میں بلاشبہ لاکھوں کی تعداد میں چھپی اور پڑھی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی عربی، فارسی اور انگریزی وغیرہ متعدد زبانوں میں اس کے تراجم چھپے اور بڑی تعداد میں دنیا میں پھیلے------ بلامبالغہ یہ کتاب اس دور کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ثابت ہوئی اور اس کے ذریعہ جہاں یورپ و امریکہ حقائق سے آشنا ہوئے وہاں اہلسنت برادری کی بڑی تعداد کے سامنے اصلیت بے نقاب ہوئی، پھر مولانا نے ہی دوسرا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ حقائق کی بنیاد پر ایک استفتا مرتب کر کے پاک و ہند کے ذمہ دار علمی و دینی اداروں اور اہل علم کے پاس بھیج کر جواب حاصل کیا اور یوں رفض و سبائیت کی گمراہ کن تحریک کے اسلام کے متوازی اور مدمقابل کافرانہ تحریک ہونے پر "اجماع امت" کا سامان فراہم کیا، اور اب یہ کتاب سامنے آئی جو ہر چند کہ ان کے خلف الرشید اور صاحب علم و فضل فرزند مولانا عتیق الرحمن حال مقیم لندن کے قلم سے ہے۔ لیکن بہرحال اس کے اجر و ثواب میں مولانا نعمانی برابر کے شریک ہیں کہ انہی کی تحریک اس کا باعث بنی۔

احقر کو چند ماہ قبل اس کتاب سے آگاہی ہوئی اور اس کا باعث جمعیت علماء اسلام کے ایک رہنما تھے جو اپنے "تبلیغی دورہ لندن" سے واپس تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے اس طرح بتلایا گویا یہ میرا کوئی خاص مسئلہ ہے اور ان کا یا ان کے قافلہ کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں اصل حسرت یہی ہے کہ آج برادران اہلسنت اور علی الخصوص ان کے مذہبی و علمی اور روحانی مقتداء رفض و سبائیت کے معاملہ میں مرعوبیت کا شکار ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں اس خالص یہودی و مجوسی تحریک کے جراثیم گھسے ہوئے ہیں اور وہ صدر اسلام سے اسلام کی مدمقابل اس گمراہ کن ملحدانہ اور کافرانہ تحریک کو محض ایک فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دے کر اپنی نام نہاد سیاسی ضرورتوں کے لئے اس کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو دی جانی چاہیئے۔

آج کے سنی اہل علم و دانش تمام مصدقہ شیعی لٹریچر سامنے آجانے کے باوصف اندھے اور بہرے پن کا شکار ہیں اور یہ حضرات اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے تو یہ "شجرۂ زقوم" اب تک اپنی جڑوں سے کٹ چکا ہوتا۔

بہرحال جب میرے علم میں کتاب آئی تو میں نے ہندوستان میں اپنے محسن، برادر بزرگ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کو لکھا۔ جنہوں نے کتاب کا نسخہ کسی صاحب کے ہاتھ بھجوایا جو لاہور آرہے تھے لیکن معلوم نہیں وہ نسخہ مجھ تک کیوں نہ پہنچا؟ کیا وہ کسٹم کے عملہ کے ہتھے چڑھ گیا یا ان صاحب کا رابطہ لاہور میں کسی ایسے سنی نما رافضی سے ہوگیا جو اس کتاب کی اشاعت اور مطالعہ میں رکاوٹ ہے؟ واللہ تعالی اعلم

خیر اللہ بھلا کرے عزیز سید کفیل شاہ سلمہ کا کہ انہوں نے مجھے کتاب ارسال کی اور اس خواہش کے ساتھ کہ میں اس

پر تعارف و تبصرہ کے حوالہ سے لکھوں۔ جو نقیب ختم نبوت میں شائع ہوسکے۔
میں نے ۲۵۶ صفحات کی اس کتاب کو اپنے باقی تمام معمولات پورے کرکے بھی دو دن میں پڑھ لیا۔ اب جو لکھنے کے لئے میرے دل میں تلاطم پیدا ہوا تو ابتدا اور انتہا سے بے نیاز لکھنے بیٹھ گیا۔

اس موڑ پر اس بات کا اظہار کرنا از بس لازم ہے کہ پاکستان کے اور خاص طور پر لاہور کے بعض ایسے بزرگ جن کے لاہور کی مذہبی کتابوں کی مارکیٹ پر گہرے اثرات ہیں، برابر اس کوشش میں ہیں کہ یہ کتاب یہاں نہ چھپے لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح حق کو چھپایا جانا ممکن ہے؟ ہمارے عزیز کفیل میاں سلمہ بہرحال اس کو چھاپنے کا تہیہ کر چکے ہیں اور کیا عجب کہ اس تحریر کے ساتھ ہی کتاب آپ کے سامنے آجائے۔ اور ہاں جناب یہ بھی سن لیں کہ اس کتاب کے خلاف جو سب سے پہلا مخالفانہ ردعمل سامنے آیا وہ لکھنؤ کی اس درسگاہ کا ہے جسے ایک دنیا "ندوۃ العلماء" کے نام سے جانتی ہے جس کے قیام کے لئے صدی بھر قبل کے بندگان اختصاص نے اللہ تعالی کے حضور دامن پھیلا کر اس کے قیام کی سعی کی اور آج اس کے نظم و انتظام کی مکمل ذمہ داری اس بزرگ عالم کے سر ہے جن کا اسم گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہے بعض اعتبارات سے ان کا ہمارے دل میں بڑا احترام ہے لیکن صدر اسلام کے مخصوص حالات و واقعات اور موجودہ عالمی تناظر میں ان کے سیاسی خیالات سے ہم اپنے آپ کو کبھی متفق نہ کر سکے۔

ان کی کتاب "المرتضیٰ" سیدنا الامام خلیفہ رابع و راشد حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالی عنہ کی سوانح حیات ہے وہ سامنے آئی تو ہمیں مولانا سراج الحق مچھلی شہری رحمہ اللہ تعالی یاد آگئے جنہوں نے مولانا مودودی کی رسوائے زمانہ کتاب "خلافت و ملوکیت" پر تبصرہ لکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ہر سید میں کسی نہ کسی درجہ میں رفض کے جراثیم ضرور ہوتے ہیں" مولانا کی کتاب "المرتضیٰ" پر ہم پہلے بھی بعض تحریروں میں گفتگو کر چکے ہیں اور یہ عرض کر چکے ہیں کہ مولانا کی نگاہ محبت نے غازی اورنگ زیب کو تو چھٹا خلیفہ راشد مان لیا لیکن خاندانی عصبیت نے سیدنا الامام خلیفہ راشد و سادس معاویہ بن ابی سفیان الاموی القرشی رضی اللہ تعالی عنہما کے حضور ان کی عقیدت کی گردن نہ جھکنے دی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فیا حسرتا۔
مولانا منظور نعمانی کی کتاب "ایرانی انقلاب" پر مولانا ابوالحسن کے ابتدائیہ نے ہم جیسے بہت سے سادہ لوحوں کو ان کے معاملہ میں کسی قدر خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ شاید وہ سادات کے مخصوص عوامل سے بلند ہو چکے ہیں لیکن آہ ثم آہ کے ان کے زیر اہتمام چلنے والے ادارہ کے ترجمان "تعمیر حیات" میں ان کے شاگرد رشید اور ندوہ کے ناظم تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس نے جو لکھا اور مولانا نے پھر جس طرح بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا اس سے ہمارا رشتہ احترام مجروح ہو گیا اور اسے ہونا ہی چاہیئے تھا کہ پندرھویں صدی کے بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں صدر اسلام کی مقدس شخصیات کی عزت و حرمت بہرحال عزیز ہے اور ہم صبح قیامت صحابہ کرامؓ کے جوتوں میں اپنے لئے بالشت بھر جگہ کی تو رب محمد ﷺ سے درخواست کر سکتے ہیں اور ہمیشہ کرتے ہیں لیکن باقی کسی کے لئے ایسے جذبات ممکن ہی نہیں خاص طور پر وہ حضرات جو ہمارے سامنے ہیں اور ہم بقائمی ہوش و حواس ان کے حالات دیکھ رہے ہیں، ان کے لئے ایسی خواہش کون کرے؟۔۔۔۔۔۔۔ ہاں ان کے اور اپنے لئے اور ہر سنی کہلانے والے کیلئے یہ دعا ضرور ہے اور بار بار کہ
"اے رب محمد ﷺ۔ قیامت کی صبح اپنے پاک محبوب نبی آخر اور معصوم آخر کے فیض یافتہ، تربیت یافتہ لوگوں کی رفاقت و صحبت، جی نہیں، ان کے جوتوں کی جگہ نصیب فرمادینا ہمیں یقین ہے کہ ان پاکبازان امت کی جوتیوں کی جگہ نصیب ہوجائے تو ربع مسکون کی دولت سے وہ افضل و اعلیٰ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللھم آمین

بجاہ نبی الانبیاً، امام الرسل خاتم المعصومین والنبیین صلی اللہ تعالی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم!

ندوہ کے بے توفیق مبصر نے جو لکھا اس پر اضطراب کے عالم میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک غیرت مند نوجوان نے مجھے براہ راست لکھا جبکہ اسی اثنا میں الفرقان کی اشاعت خاص مئی، جون ۱۹۹۲ء اور اشاعت جولائی ۹۲ء مجھے پہنچ گئی ان دونوں اشاعتوں کو پڑھنے کے بعد میں نیم بسمل ہوگیا اور سوچنے لگا کہ بار الہ، تیری زمین پر کیا ہورہا ہے، جو بندے تیرے رسول ﷺ، تیرے دین اور تیرے قرآن کے نام پر عزتیں اور دولت حاصل کر رہے ہیں وہ بھی اتنے بے دید و بے لحاظ ہو چکے ہیں کہ اصحاب محمد ﷺ کے ایک بڑے حصہ کے معاملہ میں ایسے سوقیانہ اور گمراہ کن خیالات کے حامل ہیں اور کربلا کے جعلی، مصنوعی اور افسانوی حصہ پر گفتگو کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ

"بنوامیہ نے نواسۂ رسول ﷺ کو شہید کر کے بدر میں اپنے مقتول بزرگوں کا بدلہ چکایا"

بنوامیہ جیسے عظیم قبیلہ سے وابستہ صحابہ و تابعین کے خلاف کوئی جلا سڑا رافضی یہ تبصرہ نہ کر سکے جو ندوہ کے ناظم تعلیمات نے کیا---------- اور پھر ندوہ کے عالی مرتبت مہتمم نے ندوہ کے ترجمان رسالہ میں چھپنے والی اس الحاد آمیز، گمراہ کن اور رفض کی بھرپور وکالت کرنے والی تحریر کا سیدھا سادا نوٹس لینے کے بجائے روایتی "کتاب الحیل" کے سہارے معاملات کو پس منظر میں دھکیلنے کی کوشش کی؟

تاہم اللہ بھلا کرے ہندوستان کے ان اصحاب علم و دانش کا جنہوں نے نہ صرف اس کتاب کا شاندار الفاظ میں خیر مقدم کیا بلکہ ارباب ندوہ کے اس طرز عمل کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ سب حضرات اس قابل ہیں کہ مل جائیں تو ان کے قلم چوم لئے جائیں اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے لیا جائے۔ ان سب حضرات کو فرداً فرداً مخاطب کر کے وہی بات کہوں گا جو امیر شریعت مخصوص مواقع پر فرماتے

تیری آواز مکے اور مدینے

اس ضمن میں جو نام سامنے آئے وہ آپ بھی دیکھ لیں---------- ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ---------- مولانا عبد القدوس رومی مفتی و خطیب آگرہ (مصنف کتب کثیرہ)---------- مولانا مفتی منظور احمد مظاہری قاضی کان پور و رکن مجلس شوریٰ مدرسہ دیوبند---------- چودھری علی مبارک عثمانی بارہ بنکی،---------- مولانا مجیب اللہ ندوی بانی و ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ---------- مولانا عبد العلی فاروقی نبیرہ امام اہلسنت مولانا عبد الشکور لکھنوی---------- مولانا محمد عیسیٰ لندن---------- مولانا محمد عبد اللہ بھمبر آزاد کشمیر---------- مولانا جمیل احمد نذیری مبارک پور---------- سید خالد محمود بھرائچ ریڈر شعبہ باٹنی تربھون یونیورسٹی نیپال---------- اور مولانا تسخیر الحسن ندوی بارہ بنکی۔

ان سب حضرات کے تبصرے، تحریریں انتہائی درجہ وقیع ہیں اور ان میں سے ہر تحریر کی ایک ایک سطر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، ان میں سے بعض حضرات جدید مدارس و جامعات کے ذمہ دار لوگ ہیں تو بعض قدیم مدارس و مساجد کے حوالہ سے انتہائی ذمہ دارانہ مناصب پر فائز---------- ان کی تحریروں کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے یہ حقیقت الم نشرح ہوتی ہے کہ سچائی کے طالب دنیا میں بڑی مقدار میں موجود ہیں اور جب کوئی اللہ تعالی کا بندہ صدق و راستی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آتا ہے تو وہ آواز رائیگاں نہیں جاتی۔

اس کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۳۷۳ھ میں "الفرقان" کے بعض قارئین کی خواہش پر مولانا محمد منظور کے حکم

سے ان کے فرزند مولانا عتیق نے ایک مضمون لکھا جس میں امکان بھر صحیح روایات سے سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ شہادت کو سپرد قلم کیا------------ یہ مضمون ذوالحجہ ۱۳۷۳ھ میں چھپا---- اس میں سیدنا حسین سلام اللہ تعالیٰ علیہ ورضوانہ کی سہ گانہ شرائط میں سے امیر یزید کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے (بیعت کر لینے) کی شرط پر طوفان اٹھا کہ یہ بات عقیدت میں غلو کے مارے روایت پرستوں کے لئے ایک ایٹم بم کی حیثیت رکھتی تھی---------- خود مولانا نعمانی جو اس وقت سفر میں تھے واپس آئے تو برہم ہوئے لیکن مولانا عتیق اس معاملہ کو اور بھی مبرھن کر چکے تھے اس لئے انہوں نے یہ دوسری مدلل تحریر اباجان کے سامنے رکھی تو مولانا مطمئن ہو گئے اور یہ تحریر محرم ۱۳۷۴ھ میں شائع ہو گئی جس سے طوفان رک گیا اور گز بھر لمبی زبان والوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔

چند سال قبل مولانا نعمانی کی کتاب "ایرانی انقلاب" سامنے آئی تو پرانے متعلقین نے مولانا عتیق کے تیس سال قبل کے ہر دو مضمون دوبارہ کتابی شکل میں چھاپنے کی فرمائش کی۔ مولانا نعمانی نے سعادت مند بیٹے سے فرمایا کہ دونوں مضامین نکال کر انہیں نظر ثانی کے بعد "کتب خانہ الفرقان" کے سپرد کر دو لیکن جب عتیق میاں نے انہیں نکالا تو اباحضور سے عرض کیا کہ اب تو اس موضوع پر بہت کچھ کھنگالنے اور از سر نو لکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نعمانی نے اس تجویز کو پسند کیا اور لکھنؤ کے بعد لندن کے کتب خانوں کی مہینوں خاک چھان کر اور ان گنت راتیں آنکھوں میں کاٹ کر مولانا عتیق نے یہ کتاب لکھی------ لطف یہ ہے کہ انہیں سب سے زیادہ بنیادی مواد ندوہ کے کتب خانہ سے ملا، انہوں نے ندوہ کے کتب خانہ کے ناظم کا انتہائی محبت سے شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے کتابوں کے حصول و فراہمی میں بڑا مخلصانہ تعاون کیا---------- جس کا معنیٰ یہ ہے کہ کتب خانوں میں بہت کچھ موجود ہے لیکن پڑھنے کی فرصت کم ہے، اگر فرصت ہوتی تو ندوہ کے ذمہ دار اس طرح برہم نہ ہوتے اور بنوامیہ کے بزرگ صحابہ و تابعین کی دشمنی میں اس حد تک نہ جاتے۔

مزید لطف یہ ہے کہ لندن کے امامیہ سنٹر کی لائبریری سے انہیں بہت کچھ ملا اور اس لائبریری کے شعبہ نگران کی خواہش پر مولانا عتیق نے شعبہ اسکولی کی بعض کتابیں بطور خاص حاصل کر کے مطالعہ کیں۔

اس تمام کاوش کے نتیجہ میں جو سامنے آیا اس کو انہوں نے اس عنوان سے مرتب کیا

"واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر---------- ایک نئے مطالعے کی روشنی میں"

الفرقان بک ڈپو لکھنؤ سے چھپنے والی اس کتاب کا انتساب عتیق میاں نے اپنے والد بزرگوار کے نام کیا تو ابتدائیہ مولانا نعمانی کا املا کرایا ہوا ہے جو ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ابتدائیہ میں انہوں نے اپنے آبائی قصبہ اور خاص اپنے گھریلو حالات۔ اپنی تعلیم اور اس کتاب کی شان تصنیف و تالیف پر ضروری روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب ہے جو ایک مقدمہ اور ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے---------- اپنے اپنے ذوق کی بات ہے، ہمارے نزدیک ۲۴ صفحات کا مقدمہ حاصل کتاب ہے اور اتنا جامع اور وقیع، کہ اسکو الگ سے چھپوا کر بڑی تعداد میں تقسیم کرنا آج کے ذمہ داران اہلسنت کی اہم ذمہ داری ہے اس مقدمہ میں ان سبھی بنیادی باتوں پر سیر حاصل بحث ہے، جو باتیں اس واقعہ کو دیومالائی بنانے کا باعث بنی ہیں۔ تاریخی روایتوں کا جو حال ہے، اس پر طبری کے اعتراف اور بعض مثالوں کے توسط سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کربلا کے واقعہ کے متعلق غلط بیانی کے اسباب کا تذکرہ ہے، سنی معاشرے پر شیعیت کے اثرات کی تفصیل ہے۔ نبی ﷺ کی قرابت کے احترام اور شیعی عقیدہ عصمت پر گفتگو ہے۔ لکیر کے فقیروں کو طلب علم و تحقیق پر ابھارا گیا ہے اور مومن کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔